محمد حنیف ندوی

توحید اور اقدارِ حیات

(۲)

اور انسان کی بصیرت و ادراک میں ایک ایسے طرزِ فکر کی بنیاد ڈالی ہے جسے ہم خالص علمی طرزِ فکر (Scientific) سے موسوم کر سکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اسلام ایک وسیع ترین ہے اور ایک مکمل ترین نظامِ حیات ہے۔ اس کے تین ابعاد ہیں (Dimension) فرد، معاشرہ اور کائنات، اور یہ تینوں ایسے مرتبط ہیں کہ انھیں ایک دوسرے پر مبنی اور موقوف قرار دینا چاہیے۔ اگر معاشرہ کی اصلاح نہ ہو تو اس کی آغوش میں اچھے اور کامیاب افراد کی تخلیق و پرورش ناممکن ہے اور معاشرہ موزوں اور فعال نہ ہو تو بہتر اور کامیاب افراد کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔

اور فرد و معاشرہ دونوں کا تعلق آخر میں کائنات کے بارہ میں ایک صحیح، جاندار اور عملی عقیدہ سے ہے۔ اگر یہ عقیدہ صحیح ہے، منطقی الجھنوں سے پاک ہے، اضداد سے مبرا ہے۔ اگر اس میں زندگی اور سکت ہے اور یہ اس لائق ہے کہ قلب و ذہن کے افق سے توہمات کے دل بادلوں کو ہٹا کر بصیرت ادراک کے نئے نئے آفتاب اُبھار سکے۔ تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ فرد و معاشرہ دونوں اس کی عطا کردہ روشنی سے آگے بڑھ سکیں گے اور اپنی تکمیل کر سکیں گے۔ دوسرے تمام مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے توحید ایسے صاف ستھرے اور حیات آفرین تصوّر کو پیش کر کے انسانیت کو اُبھرنے اور ترقی کرنے کے مواقع فراہم کیے۔ یہ تصور زندگی اور فکر و نظر کے

ارتقا کے لیے کس درجہ اہم ہے۔ اور اسلام کیوں اس پر نازاں ہے۔ اس کا اندازہ شرک کے تاریخی تجزیہ سے لگایا جا سکتا ہے

گذشتہ زمانے میں شرک نے چار مختلف مدارسِ فکر کی شکل اختیار کر رکھی تھی۔ ایک شرک وہ تھا جو یہودیوں میں مروج تھا۔ ایک کا تعلق اس دور کے مجوسیوں سے تھا، ایک کا عیسائیت سے۔ اور شرک کی چوتھی قسم وہ تھی جس کے حامل عرب کے مختلف قبائل تھے۔ یہودیوں کی بدنصیبی یہ تھی کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو بجائے رحیم اور رب العالمین ماننے کے ایک جابر و قاہر اور متعصب قوی ہیرو کی شکل میں تسلیم کیا۔ جس کا تعلق سوا بنی اسرائیل کے دنیا کی کسی اور قوم سے نہیں ہے۔ یہی نہیں، جس کے روبرو دنیا کی تمام قومیں، اجنبی، کافر اور بے دین ہیں، اس طرح انھوں نے گویا قوت و تشدد، یا تعصب و تنگ نگہی کو اللہ تعالیٰ کا بدل (substitute) سمجھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا اور یہی نتیجہ منطقی طور سے نکلنا بھی چاہیے تھا کہ تعصب، تنگ نظری، تشدد اور روح و معنی کے لطائف سے محرومی ان کا قومی کردار بن گیا جس سے تین ہزار سال گذرنے کے بعد بھی یہ چھٹکارا حاصل نہ کر پائے۔ مجوسیوں نے کائنات کی باگ ڈور، خیر و شر کے دو مستقل بالذات آلہہ کے سپرد کر دی۔ اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس عالم رنگ و بو میں جو نیکی اور بدی ہیں، لڑائی اور آویزش ہے یہ اسی دوئی اور ترتیب تخریب کا نتیجہ ہے۔ چناں چہ شر کا دیوتا دنیا میں ظلم، بیماری، اختلاف، جنگ، منافرت اور تاریکی پھیلانے کا ذمہ دار ہوا۔ اور خیر کا دیوتا انصاف، صحت، اتفاق، محبت، ایثار اور نور کی تخلیق کا باعث بنا۔ یہ لڑائی اگرچہ ازل سے جاری ہے تاہم ہمیشہ جاری نہیں رہے گی۔ بلکہ ایک وقت ایسا آئے گا جب خیر شر پر، اور نور ظلمت پر فتح حاصل کر لینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ مجوسیت کے اس موقف سے ایک تو یہ تاثر پیدا ہوا کہ کائنات کے اس ڈرامے میں خیر و شر کا کھیل جو کھیلا جا رہا ہے اس کے اصل ہیرو آلہہ ہیں، دیوتا ہیں۔ اور انسان کی حیثیت ایسے مجبور محض آلہ کار کی ہے، کٹھ پتلی کی ہے جو اس چپقلش میں کبھی خیر کا ساتھ دیتا ہے اور کبھی شر کا، کبھی نیکی کو فروغ دیتا ہے اور کبھی برائی کے پھیلانے میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت

ہوئی کہ علاوہ اس جبر کے جس میں یہ کٹھ پتلی انسان جکڑ دیا گیا ہے خود خیر و شر کا مسئلہ بھی انسان کا مسئلہ نہیں رہتا، بلکہ دو حریفانہ طاقتوں کا مسئلہ بن جاتا ہے ۔ لہٰذا یہ امید اور توقع کس برتے پر قائم کی جائے کہ خیر کا غلبہ ہو کر رہے گا، اور ایک نہ ایک دن اس کش مکش کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ ظلمت و تاریکی کے منحوس سائے سمٹاؤ اختیار کر لیں اور چار دانگ عالم میں بلکہ عالم تکوینی میں بھی مصالحت خیر، شادمانی اور مسرت و انبساط کی لہریں دوڑنے لگیں ۔ سوال یہ ہے کہ اس توقع کے لیے منطقی اساس کیا ہے ۔ کیا خیر کا دیوتا زیادہ زیرک، زیادہ طاقتور اور زیادہ قدرت والا ہے اور شر کا نسبتاً کمزور ہے ۔ اگر سوال کا جواب ایجاب میں ہے تو پھر اس سے بھی زیادہ تیکھا اور ٹیڑھا سوال یہ ہے کہ کیوں اس کے معنی یہ ہوئے کہ اصل میں تو خیر ہی کی حکم رانی ہے ۔ اور شر کے عناصر اس کے مقابلہ میں بہت کم اور کم زور ہیں ۔ اور اگر یہ دونوں علم و قدرت کے باب میں مساوی اور یکساں ہیں ۔ تو خیر کے اُبھرنے اور شر کے مٹ جانے کے فیصلہ یا توقع کو کس بنیاد پر استوار کیا جائے گا ۔ مجوسی فلسفہ کے پاس اس اشکال کا کوئی جواب نہیں ۔

شرک کی اس نوعیت سے جس کو ثنویت (Dualism) کی صورت میں مجوسیت نے پیدا کیا، ایران، عراق میں کہیں بھی مثبت تہذیب پیدا نہ ہو سکی ۔ مثبت اور جاندار اخلاقی قدریں نہ پنپ سکیں ۔ اور خطۂ ارض پر کہیں بھی کوئی ایسی قوم منصۂ شہود پر نہ آ سکی جو انسانیت کی جھولی میں سعادت و برکت کے برگ و بار ڈال سکے ۔ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ اس تحریک نے صرف دلوں میں شکوک پیدا کیے ہیں ۔ مذاہب عالم کے خلاف سازشیں کی ہیں اور کردار و عظمتِ انسانی کو عظیم نقصان ہی پہنچایا ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ شرک کی یہ صورت اپنی زہر چکانیوں کے باوجود صدیوں زندہ رہی، اور یہ فخر اسلام کو اور اس کے نظریۂ توحید کو حاصل ہے کہ انسان نے اس بدعقیدگی اور گمراہی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات پائی ۔

عیسائیت نے جس شرک کو اختیار کیا اس کی تمام تر ذمہ داری سینٹ پال پر عائد ہوتی ہے یہ شخص عقیدۃً یہودی تھا ۔ اور یہودیت کے تشدد، غیر روحانی تصوّرات اور تعصّبات نے اس

کے دل میں اس کے خلاف بغاوت کے شعلوں کو بھڑکا دیا۔ حضرت مسیح کی سیدھی سادی زندگی اور تعلیم بھی اسے متاثر نہ کر سکی لیکن یہودیت سے انتقام لینے کی ایک ہی صورت ممکن تھی وہ یہ کہ یہ عیسائیت کو بہ ظاہر قبول کرلے اور اس کو اپنے نیم فلسفیانہ مزعومات کے قالب میں ڈھال کر پیش کرے۔

چناں چہ اس نے یہی کیا۔ یہودیوں کی گمراہی یہ تھی کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ میں ان بشری صفات کو ڈھونڈھ نکالا جو تعصب، کبر، اور نفرت پر مبنی تھیں۔ اور یہ سمجھا کہ وہ بزرگ اور متعال خدا جو ہر طرح کی تشبیہ و مماثلت سے پاک اور بلند ہے۔ انسانی صفات کے متصف ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان بشری کمزوریوں سے بھی بہرہ ور ہے جن کا مرتبہ سطح انسانیت کے لحاظ سے بھی فروتر ہے۔ پال نے اس کے مقابلہ میں یہ تصوّر پیش کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمتوں کو ایک شخص کے قالب میں سمیٹ لیا ہے۔ اور اپنی غیر محدود رفعتوں کے اظہار کے لیے ایک محدود انسان کو چن لیا ہے۔ یہ پیکر محدود جو اپنے اندر غیر محدود وسعتوں کو لیے ہوئے ہے مسیح ہے اور اس میں بشریت کے پہلو بہ پہلو الوہیت کا اقنوم و عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ یہودیوں کی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے خدا کو انسان فرض کیا اور عیسائیت کی گمراہی یہ ہے کہ اس نے انسان کو خدا قرار دیا۔

لطف یہ ہے کہ پال سے لے کر ایکوی ناس (Aquinas) تک اور ایکوی ناس سے لے کر موجود مغربی مفکرین تک عیسائیت کے اس کارنامہ پر پھولے نہیں سماتے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس عظیم دریافت سے انسان بشریت کے حضیض سے نکل کر لاہوت کے افق اعلیٰ تک جا پہنچا ہے۔ ان کی رائے میں یہودیت نے خالق و مخلوق کے مابین جن فاصلوں کی تخلیق کی تھی اور بُعد اور دُوری اور دوری و محرومی کی جن شقاوتوں کو جنم دیا تھا پال کے اس تصوّر الوہیت سے اس کی تلافی ہو جاتی ہے اور انسان پھر سے اس لائق ہو جاتا ہے کہ عشق و وصال کے داعیوں کی تسکین کا اہتمام کر سکے۔ اور یہ تصوّف و معرفت کی وہ معراج ہے جن کے انکشاف

کا سہرا صرف عیسائیت کے سر ہے ۔ اس نے پہلی دفعہ ان فاصلوں کو دور کیا۔ اس مجبوری سے انسان کو نجات دلائی جس کو یہودی علم الکلام اور فقہ نے پیدا کر رکھا تھا۔ اور بتایا کہ محبت و عشق کی بے کرانیوں نے اظہار کے لیے ایک نقطۂ اتصال ڈھونڈ نکالا ہے جس کو پا لینے کے لیے انسان ایک عرصہ سے بے قرار اور آرزومند تھا۔ اس مرحلہ پر ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ کہ انسان خدا کا یہ تصور پہلے ہی قدم پر تناقض سے دوچار ہے کیوں کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ منطق کی اصطلاح میں انسان اور خدا دو جُدا جُدا حقیقتیں نہیں بلکہ ایک ہی جنس کے دو ایسے فواصل (متماثلان) ہیں جو باہم متحد ہیں یعنی انسانی فصل اور الٰہی فصل میں کوئی حد فاصل ہی نہیں۔ ہم یہ بھی ثابت نہیں کرنا چاہتے کہ اس طرح انسان تو کیا اونچا ہو گا، اللہ تعالیٰ کا مقام فروتر ہو جاتا ہے۔ سردست یہ اعتراض بھی وارد نہ کیجئے۔ انسان خدا کے معنی، انسان اور خدا دونوں کے نفی کی ہیں۔ اس لیے کہ جو انسان نوع انسانی سے ترقی کر کے الوہیت کی دہلیز پر قدم زن ہوتا ہے وہ انسان کہاں رہا۔ وہ تو اس سے آگے کی کوئی نوع ہوا۔

اسی طرح جس لامحدود نے اپنے کو "محدود" کے قالب میں ڈھال لیا وہ خدا کب رہا۔ اس نے تو لامحدودیت کو چھوڑ کر محدودیت اختیار کر لی۔ ان ڈھیر سارے استحالوں سے قطع نظر سوال یہ بھی نہیں کہ یہ ارتقاء کی کون قسم ہے اور آیا یہ مقام مسیح کے سوا اوروں کو بھی مل سکتا ہے یا نہیں۔ اصل موضوع کو سامنے رکھتے ہوئے اس مقام پر ہم جو چیز دریافت کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس عقیدہ کا اثر ذہن انسانی اور اس کے اسلوب فکر پر کیا پڑتا ہے اور کس نوع کا سانچہ تیار ہوتا ہے۔ کیا ذہن حلول و تثلیث کے اس عقلی گورکھ دھندے سے منطقی تاب و ضو حاصل کرتا ہے یا اذعانیت (Dogmatism) کی اتھاہ اور تاریک گھاٹیوں میں جا گرتا ہے۔

جواب کے لیے علم الکلام کی ورق گردانی کی ضرورت نہیں۔ مدرسیت کی پوری تاریخ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ کلیسا صدیوں اذعانیت کی اس اوگن گھاٹی میں اُلجھا رہا۔ اور جب ہزار کوشش کے باوجود تناقضات عقلی کے الجھاوؤں سے مخلصی حاصل نہ کر سکا۔ تو

مجبور ہوا کہ عقل و دین کی راہیں الگ الگ متعین کرے۔ اور ڈنکے کی چوٹ اعلان کرے کہ عقیدہ کا یہ اسلوب عقل و فہم کی گرفت میں آنے والا نہیں۔

رہا یہ ادعا کہ یہ انکشاف تصوف کی آخری معراج ہے اور اس سے انسانی روح کو ارتقاء و تکمیل کا وہ اوجِ رفیع حاصل ہوتا ہے جس کا حصول کسی اور ذریعہ سے ممکن ہی نہیں تو یہ محض الفاظ کی جادوگری ہے اور خوش ترکیب جملوں کی مرصع کاری ہے ورنہ کون نہیں جانتا کہ تصوف ایک طرح کی مسلسل جدوجہد، مسلسل سوز و گداز چاہتا ہے۔ اور اس اخلاقی و روحانی تگ و تاز کا طالب ہے جو کبھی ختم نہ ہو۔ تصوف کا مطمحِ نظر ایسا محبوب ہے جو اگرچہ کبھی بھی واہمہ و فکر کی آغوش میں نہیں آپاتا۔ تاہم ہر ہر منزل پر سالک ایسی لذت ناتمام محسوس کرتا ہے، ایسی تکمیل سے دوچار ہوتا ہے، ایسے انوار کو ——— اپنے دامنِ طلب میں سمیٹتا ہے کہ جن کے لیے کہیں اختتام نہیں، انتہا نہیں۔ اور آخری سرحد اور کنارہ نہیں۔ اگر مطمحِ نظر حاصل ہو گیا۔ اور محدود نے لامحدود کو پالیا تو تگ و دو، سعی و طلب کے لیے باقی کیا رہا۔ مزید برآں انسان خدا کے اس اتحاد و حلول سے بشریت نے تو اپنے قابلِ فخر حدود و امتیاز کو خیرباد کہا۔ اور الوہیت کا فراز اعلیٰ گر کر بشریت کے قدموں پر آرہا۔ کیا "ضعف الطالب والمطلوب" کا اس سے بہتر کوئی مصداق ہو سکتا ہے؟ اور کیوں نہ ہو اذعانیت کے بطن سے آخر اسی نوع کے افتاد و تناقضات تو صادر ہوں گے۔

غرض یہ ہے مذاہبِ عالم کا وہ تاریخی تجزیہ جس سے شرکیہ عقائد کا صحیح صحیح پس منظر ابھر کر نظر و فکر کے سامنے آتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نظریہ توحید کا فروغ نوعِ انسانی کے لیے کس درجہ برکت و سعادت کا حامل ہے؟ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خصوصیت سے ذہنِ انسانی کو اس نظریے نے کس درجہ تابناکی بخشی ہے، کس درجہ استدلال و بیان کی استواریاں عطا کی ہیں۔ اور کس درجہ فکر و تعمق کی صلاحیتوں کو تابش و ضوء سے بہرہ مند کیا ہے۔ اس کو تسلیم کر کے انسانی ذہن کا سانچہ کتنا بدلا ہے، غور و تعمق کا معیار کتنا اونچا ہوا ہے اور کس طرح انسان

ایک عرصہ تک جہل و تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے بعد اس لائق ہوا ہے کہ تمام تعصبات اذعانات اور تضادات سے دامن کشاں رہ کر اپنے لیے ایسا اسلوب و نہج اپنا سکے۔ جو معقول، متوازن اور صحیح ہو۔

(مسلسل)

تعلیمات غزالی

مولانا محمد حنیف ندوی:

فقہ و تصوف میں کیا تعلق ہے اور اسلامی نقطۂ نظر سے تصوف کا کیا مقام ہے؟ نیز اس کی اصطلاحیں کن معنوں میں استعمال ہوتی ہیں؟ ان تمام سوالات کا تسلی بخش جواب۔

صفحات ۵۷۲ — ۱۰ روپے

افکارِ غزالی

مولانا محمد حنیف ندوی:

امام غزالی کے شاہکار "احیاء علوم الدین" کی تلخیص اور ان کے افکار پر سیر حاصل تبصرہ۔ دوسرا ایڈیشن زیرِ طبع

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ، لاہور